⊙ صدف مشتاق
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
⊙⊙ ڈاکٹر پروین کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی عکاسی

Abstract:

Sadat Hassan Manto was born in Komrilala, Ludhiyana, Punjab on 11th May 1916. His forefathers were Kashmiri Pandits. He wrote fiction and is the most reknowned short story writer of Urdu. Mato's writings reflect superstitions and old beliefs. He believes that our society is a victim of superstitions and wrong beliefs. He is of the view that our society is facing social decline and most of the people do wrong deeds to please Muslim monks. This article represents a critical analysis of Manto's fiction in the context mentioned above.

Keywords:

Manto Fiction Shortstory Superstitions Beliefs Decline Society

یہ ایک ازلی حقیقت ہے کہ ادب نے جو نہج اپنائی اس کا مدعا و منتہا نوع انسانی کی خیر خواہی و راہنمائی تھی۔ تخلیق کار جہاں زمانے کی نبض بن کر دھڑکتا ہے وہاں مسائل سماج کی چارہ گری بھی کرتا ہے۔ اور بطور خاص توہمات، وساوس، گمان، تشکیک ایسے انسانیت سوز پہلوؤں کو نشان زد ہی نہیں کرتا بلکہ ان کو اقدار حیات بننے سے روکتا بھی ہے۔ اہانت آمیز قدروں کو حقائق کی روشنی میں رد کرتا ہے اور آفاقی و فطری اصولوں کو مدنظر رکھتے ہو انسانیت کی خیر خواہی کا علمبردار ہوتا ہے۔ ہر اچھا تخلیق کار کسی ایسے نظام حیات کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جو مستقبل میں انسانی فلاح و بہبود و کامرانی کا ضامن ہو۔ توہمات کے سبب شر اور فساد کا سدباب کرتا ہے۔ تہذیب جدید میں یہ فحش غلطی در آئی وہ دراصل عقل و ایمان کے مابین تفریق و انفصال کے سبب سے تھی۔ اس نے پہلا کام کام ہی یقین و ایمان کا وہ عالم درہم برہم کیا جس پر شرف انسانیت کا دارومدار تھا۔ اردو دنیا میں منٹو نے اس آہنگ کو افسانے میں بنیادی ٹریٹمنٹ کے طور پر برتا۔

سعادت حسن منٹو کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ وہ ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء کو مرالہ لدھیانہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔منٹو کا اصل نام سعادت حسن تھا لیکن ادبی دنیا میں منٹو کے نام سے پہچان پائی۔منٹو نے افسانے اور ڈرامے میں طبع آزمائی کی۔اُن کے افسانوں میں توہم پرستی اوضعیف الاعتقادی کے عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔منٹو کے خیال میں ہمارا معاشرہ توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا شکار ہے۔اُن کے خیال میں یہ معاشرہ سماجی پستیوں کا شکار ہونے کی بنا پر اپنے پیروں اور مرشدوں کے لیے وہ سارے کام کرتا ہیں جو مذہبی طور پر بھی جائز نہیں ہوتے۔اس خاص موضوع کو منٹو نے کئی افسانوں میں پیش کیا ہے۔مثلاً 'سراج' میں انھوں نے ڈھونڈو کو شدید ضعیف الاعتقادی کا شکار کردار دکھایا ہے کہ وہ اپنے موکلوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا ہے۔سعادت حسن منٹو 'سراج' میں یوں رقم طراز ہیں:

''معلوم نہیں، اس کا اصل نام کیا تھا۔مگر سب اسے ڈھونڈو کہتے تھے۔اس لحاظ سے تو مناسب تھا کہ اس کا کام اپنے موکلوں کے لیے ان کی خواہش اور پسند کے مطابق ہر نسل اور ہر رنگ کی لڑکیاں ڈھونڈنا تھا۔''(۱)

سعادت حسن منٹو ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم جیسا سوچتے ہیں ہمارے ساتھ ویسا ہی پیش آتا ہے۔یہ دراصل ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔مثلاً اُن کا ایک افسانوی کردار فہمیدہ بچپن ہی سے سرمے کا استعمال بہت کرتی ہے آخر اس کی شادی کی ساری تیاریاں ختم ہوتی ہیں تو وہ اپنی ماں سے کہتی ہے کہ وہ سرمہ جو اِن کے ہاں آتا ہے چاندی کی سرمے دانی میں ڈال کر اسے ضرور دیا جائے۔شادی سے پہلے سرمہ اس کے لیے کامیابی کا باعث ہوتا ہے اور شادی کے بعد اس کے لیے کالک کا باعث بنتا ہے۔بچہ ہوتا ہے تو وہ اپنے نومولود بچے کی آنکھوں میں بھی اس کا بہت استعمال کرتی آخر کار فہمیدہ توہم پرستی کا شکار ہو جاتی ہے کہ اس کے بچے کی موت کا سبب سرمہ بنا ہے کیوں وہ سرمے میں بہت خوبصورت لگتا تھا۔

سعادت حسن منٹو 'صاحبِ کرامات' میں پیروں، فقیروں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور اُن کے سامنے سجدہ ریز توہم پرستوں کو یوں پیش کیا ہے:

''فقیر کہاں سے آئیں گے ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا ان کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا اِن کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔اللہ تبارک نے جدھر حکم دیا چل پڑے۔جہاں ٹھہرنے کا حکم ہوا ٹھہر گئے۔چودھری موجو دپر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا اس نے آگے بڑھ کر اس بزرگ کا ہاتھ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں لیا چوما آنکھوں سے لگایا ''چودھری موجو کا گھر آپ کا اپنا گھر ہے'' اللہ جل شانہ کو جانے تیری کون سی ادا پسند آئی کہ وہ اپنے اس حقیر اور عاصی بندے کو تیرے پاس بھیج دیا۔''(۲)

یہ پیر فقیر معاشرے کے سادہ لوح لوگوں کو لوٹتے ہیں ان سے اپنی خدمت کرواتے ہیں۔وہ لوگوں کی نفسیاتی کمزوریوں کے نقیب ہوتے ہیں۔انھیں اپنے فریب کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی عزتوں سے کھیلتے ہیں کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلتا ہمارے معاشرے کی برقعہ پوش عورتیں ان کے سامنے پردے اٹھا لیتی ہیں یہ پیر شہوت کا شکار ہو جاتے ہیں ان پر اپنی ہوس کی آگ مٹاتے ہیں۔یہاں پر سعادت حسن منٹو بتا رہے ہیں کہ کس طرح یہ فقیر موجو کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اپنی بیوی

پھاتاں کو لے آؤ اور اس کے پیچھے جینا کی عصمت سے کھیلتا ہے۔سعادت حسن منٹو 'صاحب کرامات' میں جعلی پیروں، عاملوں کی عیش پرستی کی بات بھی کرتے ہیں کہ یہ پیر شراب کے رسیا ہیں، زنا ان کی عادت بن چکا ہے لیکن پھر بھی ہمارا معاشرہ ان کی پیروی کرتا ہے۔ یہ توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی نہیں تو اور کیا ہے؟ اقتباس دیکھئے:

''ان کے ارشاد کے مطابق شراب کا گھڑا لا کر ان کے قریب رکھ دیا مولوی صاحب نے کچھ پڑھا گھڑے کا منہ کھول کر اس میں تین بار پھونکا اور دو تین کٹورے چڑ گئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا کچھ پڑھا اور بلند آواز میں کہا ''ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اتریں گے مولا۔'' موجو جا، حکم ملا ہے ابھی جا اور اپنی بیوی کو لے آ۔ راستہ مل گیا ہے ہمیں، وضو کرانے کے بعد مولوی صاحب نے جائے نماز مانگی نہ ملی ڈانٹا۔ کیس منگوایا اس کو اندر کی کوٹھری میں بچھوایا اور جینا سے کہا کہ باہر کی کنڈی لگا دے کٹورا جو آدھا بھرا تھا اس میں تین تین پھونکیں ماری جینا کی طرف بڑھا دیا ''پی جاؤ اسے'' مولوی صاحب اسی طرح آنکھیں بند کیے تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ پھیرے رہے جینا نے محسوس کیا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے جیسے اس کو نیند آ رہی ہے پھر اس نے نیم بے ہوشی میں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی مونچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔'' (۳)

مولوی صاحب سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مولوی صاحب صبح کو غائب، جینا پریشان کہ مولوی صاحب کے طفیل سے اس کی ماں نے گھر آنا تھا۔ مولوی صاحب غائب ہو گئے ہیں۔ سعادت حسن منٹو بتا رہے ہیں کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو آگ لگاتے ہیں۔ نماز، روزے کا تو ان مسلمانوں کو پتا نہیں مولوی کی کرامات سے گھر بسانا ان کی عادت ہے۔ مولوی جو خود شراب پیتا ہے زنا کا عادی ہے۔ وہ اس قابل کہاں کہ لوگوں کے کام آ سکے۔ افسانہ نگار بتانا چاہتے ہیں کہ معاشرے نے اپنی عزتیں بیچ ڈالیں ہیں لیکن توہم پرستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ موجو پھاتاں کو لے کر گھر آتا ہے تو جو جنت مولوی صاحب نے موجو کی لاڈلی جینا کو دکھائی تھی وہی اس کی ماں پھاتاں کو دکھانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے غریب کو۔ اس سے بھول ہو گئی آواز آئی، ہم ہر روز تیری سفارش کب تک سنیں گے تو اپنے لیے جو بھی مانگ ہم دینے کے لیے تیار ہیں میں نے عرض کی میرے شہنشاہ بحر و بر کے مالک میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا، تیرا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ موجو چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے ارشاد ہوا کہ ہم اس کی محبت اور تیرے ایمان کا امتحان لینا چاہتے ہیں ایک دن کے لیے تو اس سے نکاح کر لے دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے۔ ہم تیرے لیے بس صرف یہی کر سکتے ہیں کہ تو نے چالیس برس سے ہماری مدد کی ہے۔'' (۴)

''صاحب کرامات'' میں پیر صاحب موجو سے کہتے ہیں کہ موجو میں تیری بیوی اور تیرے لیے دعا کی ہے کہ

اللہ ان دونوں کوملا دیں تو مجھے غیب سے آواز آئی ہے۔ پہلے تم ایک دن کے لیے موجو کی بیوی سے نکاح کرو پھر اسے طلاق دے کر موجو کے حوالے کردو۔ ہم تیرے لیے صرف یہی کر سکتے ہیں کیوں کہ تم نے چالیس سال ہماری خدمت کی ہے۔ پیر صاحب موجو کو اپنی باتوں میں لبھا لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تو ہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے خیال میں شادی کے بعد عورت سب سے بڑی خواہش اولاد ہوتی ہے معاشرے کے اندر دوسری شادی رواج بن گیا ہے۔ عورت کو بانجھ قرار دیا۔ بانجھ عورت اپنی ماں سے، بہن سے دوسری عورتوں سے مشورے کرتی ہیں۔ ڈاکٹروں ،حکیموں سے علاج کرواتی ہیں اور روحانی علاج کے واسطے شاہ جی کے ہاں تشریف لے جاتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو 'شاہ دولے کا چوہا' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ شاہ دولے صاحب کی برکت ہے...... مجھ سے ایک عورت نے کہا تھا! اگر اولاد چاہتی ہو تو گجرات جا کر شاہ دولے کے مزار پر منت مانو اور کہو کہ حضور، جو پہلا بچہ ہوگا وہ آپ کی خانقاہ پر چڑھاوے کے طور پر چڑھا دیا جائے گا۔۔۔ فاطمہ نے سلیمہ کو یہ بھی بتایا کہ جب شاہ دولے کے دربار پر ایسی منت مانی جاتی ہے تو پہلا بچہ ایسا پیدا ہوتا ہے جس کا سر بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور وہ پہلا بچہ اس خانقاہ پر چھوڑ آنا پڑتا ہے۔''(۵)

عورتیں جو وہم کا شکار ہوتی ہیں اپنے خاوندوں سے جھوٹ بول کر مزاروں پر جا کر منتیں مانگتی ہیں۔ منٹو دکھاتے ہیں کہ سلیمہ جب فاطمہ کے ساتھ شاہ دولے کے مزار پر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہاں ایک لڑکی ہے جو عجیب وغریب حرکتیں کر رہی ہے آخر کار سلیمہ ماں بنتی ہے بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ماں کی ممتا اس بچہ کو شاہ دولے کے مزار پر چڑھانے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ فاطمہ کے ورغلانے پر اور اپنی ضعیف الاعتقادی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہ کہیں وہ کسی آفت کا شکار نہ ہو لڑکے کو مزار کے مجاروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ 'شاہ دولے کا چوہا' میں سلیمہ جب اپنے بیٹے کو شاہ دولہ کے مزار پر چڑھا دیتی ہے اس کے بعد ماں کی ممتا اس کو جینے نہیں دیتی ہے، سوتے جاگتے ہر لمحہ وہ پریشان رہتی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

> ''وہ عجیب عجیب خواب دیکھتی ہے۔ شاہ دولے کا چھوٹے سر والا چوہا اس کے پریشان تصور میں ایک بہت بڑا چڑھاوا بن کر نمودار ہوتا ہے۔ جو اس کے گوشت کو اپنے تیز دانتوں سے کترتا ہے...... وہ چیختی ہے اور اپنے خاوند سے کہتی ہے،'' مجھے بچایئے۔ دیکھیے چوہا میرا گوشت کھا رہا ہے۔''(۶)

انسان ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوتا ہے تو وہ نفسیاتی مریض بن جاتا ہے جو بات انسان کے دماغ میں بس جاتی ہے اس کو ہر طرف وہی چیز نظر آتی ہے۔ سلیمہ کے دماغ میں چوہوں کا خوف سما جاتا ہے تو اس کو ہر جگہ پر چوہے ہی نظر آتے ہیں۔ سلیمہ بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شوہر نجیب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کی بیماری کا باعث ضعیف الاعتقادی تھی۔ نہ ہی بیوی ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوتی ہے بلکہ مرد بھی ضعیف الاعتقاد ہے۔ نجیب کو احساس ہی نہیں وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کا نہیں شاہ دولے صاحب کا تھا۔ 'شاہ دولے کا چوہا' میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی اس حد تک دکھائی گئی ہے کہ لوگ اپنے لختِ جگر کا چڑھاوا بھی مزاروں پر چڑھانے سے دریغ نہیں کرتے ہیں:

''جب سلیمہ کا بخار بالکل اتر گیا اس کے دل و دماغ کا بخار ٹھنڈا پڑ گیا نجیب نے اسے کہا: ''میری جان اپنے بچے کو بھول جاؤ۔۔۔وہ صدقے کا تھا۔'' سلیمہ نے بڑے زخم خوردہ لہجے میں کہا: میں نہیں مانتی۔ساری عمر میں اپنی ممتا پر لعنتیں بھیجتی رہوں گی کہ میں نے اتنا بڑا گناہ کیوں کیا۔میں نے اپنا لختِ جگر اس مزار کے مجاروں کے حوالے کیوں کیا۔وہ مجاور ماں تو نہیں ہو سکتے۔''(۷)

سلیمہ تین بچوں کی ماں ہوگئی مگر پہلے بچے کو نہ بھولی، گجرات جاتی ٹکریں مارتی، اپنے بچے کو تلاش کرتی۔وہ مزار پر جا کر پکارتی ہے بیٹا میں تیری ماں ہوں مگر بیٹا پاگل بن چکا ہوتا ہے، اب وہ مجیب نہیں بلکہ اک بھکاری ہے۔ماں اپنے بھکاری بچے کو دیکھ کر اپنی ممتا پر لعنت بھیجتی ہے کہتی ہے کہ میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔'شاہ دولے کا چوہا' کا منظر دیکھئے:

''بیٹے، میں تیری ماں ہوں۔شاہ دولے کا چوہا بڑے بے ہنگم انداز میں ہنسا۔۔۔اپنی ناک کی رینٹھ آستین سے پونچھ کر اس نے سلیمہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔''ایک پیسہ۔'' سلیمہ نے بالآخر پانچ سو روپوں پر راضی کیا وہ رقم ادا کر کے جب اندر آئی تو مجیب غائب تھا۔مجیبہ نے اس کو بتایا کہ وہ پچھواڑے سے باہر نکل گیا تھا۔سلیمہ کی کوکھ پکارتی رہی۔مجیب واپس آ جاؤ......مگر وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔''(۸)

گویا سلیمہ کی کوکھ ساری عمر مجیب کو پکارتی رہتی ہے مگر وہ واپس نہیں آتا۔مزار پر جا کر روتی ہے مدد مانگتی ہے مگر بچہ نہیں ملتا ہے۔

سعادت حسن منٹو نے توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی منظر کشی کرتے ہوئے یہ تک دکھایا ہے کہ اگر کوئی چور کسی کا مال لوٹ کر بھاگتا ہے اور کسی کنویں میں گر کر مر جاتا ہے۔تو لوگ اس کی قبر کو مزار بنا ڈالتے ہیں۔کہتے ہیں یہ بڑے عالی شان بزرگ تھے اس کی قبر پر دیئے جلائے جاتے ہیں۔اس کی پرستش کی جاتی ہے اور منتیں مانگی جاتی ہیں۔پھر شیر خوار بچے، ماؤں کے لختِ جگر ان مزاروں کی نذر ہوتے ہیں۔اس سے بڑھ کر معاشرہ اور کیا ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو۔سعادت حسن منٹو' کرامات' میں ایک منظر یوں کھینچتے ہیں:

''ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹیں تھیں ایک تو وہ جوں کی توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنویں میں پھینک آیا لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے کنویں میں رسیاں ڈالی گئیں دو جوان نیچے اترے اس آدمی کو باہر نکال لیا......لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لیے اس کنویں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔''(۹)

'کرامات' میں مزید دکھایا گیا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنی مرضی سے مزار تعمیر کر لیے ہیں اور ان مزاروں کی پوجا شروع کر دی ہے۔جمعرات کو ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔موم بتیاں جلاتے ہیں۔جب ملک کے حالات خراب ہوتے ہیں یا گھر کے حالات خراب ہوں تو انسان کی اپنی صحت ٹھیک نہیں رہتی، ایسے میں وہ سمجھتا ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا

ہے۔کسی کی اولاد کی کارکردگی ٹھیک نہ ہو اس کو بھی لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے بڑوں کی خدمت نہیں کی اس لیے مصائب کا شکار ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں سوچنے کا یہ انداز معمول کی بات ہے۔سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں میں انسانوں کے سوچنے کے اس انداز کو بخوبی پیش کیا ہے۔'نیا قانون' منٹو کا بہت معروف افسانہ ہے اس میں بھی منٹو نے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب ہندو مسلم فسادات کی باتیں ہوتی ہیں تو منگو ٹانگے والا ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو کر سمجھتا ہے کہ یہ کسی بزرگ کی بددعا کا نتیجہ ہے:

> ''یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے اور دیکھ لو۔جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔''(۱۰)

'رحمت خداوندی کے پھول' میں منٹو نے ڈاکٹر لاتھر کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو بخوبی موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر لاتھر اپنے کالج کو اپنے لیے دربار سمجھتا تھا۔اس کے خیال میں کالج حاضری بہت ضروری تھی۔اقتباس دیکھئے:

> ''ڈاکٹر لاتھر اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑا ہوا تھا اتنے عرصہ سے کہ اب کالج کی عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ کالج اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔''(۱۱)

سعادت حسن منٹو اپنے معاشرے کے نباض ہیں۔اُن کے خیال میں بعض گناہ ایسے ہیں جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے سر چڑھا لیے ہیں ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ گناہ ہے جیسے ایسا کاغذ زمین پر گر پڑے جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ ہم سے گناہ سرزد ہو گیا حالانکہ ایسی بات قرآن و حدیث میں کہیں بھی نہیں ہے۔شام کی اذان ہو رہی ہے پانی مت پیو کیونکہ شام کے وقت پانی پینا گناہ ہے۔یہ باتیں نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ آج کل کی نئی نسل بھی ایسے ہی توہمات کا شکار ہوتی ہے۔

سعادت حسن منٹو کے خیال میں ہمارا جب خود کام کرنے کو دل نہ چاہتا ہو تو انسان بہانہ تلاشتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں کا منحوس چہرہ دیکھا تھا اس لیے کام نہیں ہوا۔ جب ہم اپنا کام دل جمی سے کرو گے تو کوئی بھی نحوست پیش نہیں آئے گی۔جب انسان ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو جاتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ فلاں بندہ منحوس ہے اگر میں نے اس کا منہ دیکھ کر کام شروع کیا تو میرا کام ضرور بگڑ جائے گا اور ایسا ہو بھی جاتا ہے۔یوں ایک عام آدمی میں ضعیف الاعتقادی بڑھتی جاتی ہے۔منٹو نے ان سب معاشرتی خرابیوں کو مختلف کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔'پیرن' افسانے میں برج موہن جو پیرن کا دوست ہے اس کو اس بات کا یقین ہے کہ پیرن منحوس ہے کیونکہ وہ ہر اتوار کو آٹھ آنے کرائے کے قرض لے کر پیرن سے ملنے جاتا ہے جب وہ اس سے مل کر آتا ہے تو وہ بے روزگار ہو جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ جب آپ کام دل لگا کر نہیں کرو گے تو مالک آپ کو کام سے فارغ کر دیں گے اس میں کسی کو منحوس کہنا یا سمجھنا ضعیف الاعتقادی کی واضح مثال ہے۔

'پیرن' سے اقتباس دیکھئے:

> ''اس کی نحوست...... میں اس کا امتحان لے رہا ہوں...... یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا......اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔''(۱۲)

سعادت حسن منٹو نے اس موضوع کو عشق اور محبت کے نشے کے ساتھ جوڑ کر بھی مختلف افسانوں میں دکھایا ہے۔ وہ اس کیفیت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جب انسان محبت کے نشے میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی ہے وہ ہر وقت اپنی محبت کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے، کبھی میٹھے بول سے کبھی شرائط پوری کر کے اور کبھی جادو کا سہارا لے کر، کبھی قبرستان جا کر رات بھر چلّے کر کے۔ اپنے افسانے 'منتر' میں انھوں نے دکھایا ہے کہ شاہ صاحب جو ایک دکان دار ہیں ایک برقع پوش لڑکی پہ عاشق ہو جاتے ہیں تو ان کی آنکھیں ہر وقت نمناک رہتی ہیں۔ ایک دن شاہ صاحب کی دکان پر بلونت سنگھ مجیٹھیا آتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ شاہ صاحب کسی پر عاشق ہو چکے ہیں۔ بلونت سنگھ انھیں چند منتر بتاتا ہے کہ ان کی مدد سے لڑکی تیرے پیروں میں آ کر گرے گی اور تجھ سے محبت کا اظہار کرے گی۔ 'منتر' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس نے مجھے ایک منتر بتایا:
> منتر بتایا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منگل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طرح سنگھاؤ...... یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔''(۱۳)

منٹو نے ایسی معاشرتی برائیوں کو گہرے طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اُن کے خیال میں منتر انسانی کمزوریوں کا اظہار ہوتے ہیں اور انھی کمزوریوں کا شاطر لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک اور افسانے 'محمودہ' کے مرکزی کردار محمودہ کا شوہر نامرد ہونے کے ساتھ ساتھ نکما بھی ہوتا ہے سوا اُس کا کام صرف چلے کاٹنا اور بزرگوں کی قدم بوسی کرنا ہے۔ شوہر اپنے چلوں میں مصروف۔ یہاں پہ منٹو ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھنا ان کی خدمت میں وقت ضائع کرنا انسانی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ محمودہ کا شوہر عورت کے قابل نہیں ہوتا اس لیے وہ فقیروں کے پاس اور سنسیاسیوں کے پاس ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے۔ 'محمودہ' کا اقتباس دیکھئے:

> ''آپ سن تو لیجیے۔۔۔ ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔ لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی، وظیفے کرتا ہے، چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے گھر بار سے بالکل غافل ہو گیا ہے داڑھی بڑھا لی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے۔ کام پر بھی نہیں جاتا جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ہوتا ہے۔۔۔ فاقہ کشی اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پیاری ہے۔''(۱۴)

سعادت حسن منٹو ''محمودہ'' میں معاشرے کے اندر پائی جانے والی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو موضوع بناتے ہوئے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر شوہر کام نہ کرے تو عورتیں پیروں، فقیروں کے پاس جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ پیر صاحب کوئی ایسا تعویز دے دیں کہ میرا خاوند کام کرنا شروع کر دے۔ کسی دربار کو مشکل کشا سمجھنا ایمان کی کمزوری ہے اور

خدمت کرنے والے شخص کو فرشتہ کہنا یا پیر ماننا غلط ہے۔لیکن یہ ایسی روش ہے جو ہمارے معاشرے میں عام ہے۔

اپنے ایک اور افسانے 'حمد بھائی' میں منٹو نے پڑھے لکھے طبقے کی ضعیف الاعتقادی کو پیش کیا ہے۔'حمد بھائی' کی خوبیاں جب اس انداز میں بیان کی جاتی ہیں جیسے وہ ایک فرشتہ ہیں تو پڑھا لکھا ڈاکٹر بھی اس کی بزرگی اور فرشتہ صفتی پر یقین کرنے لگتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''کسی درگاہ میں ہوکر وہ اس تانگے میں واپس عرب گلی آ جاتا۔دیکھو، اگر، '' عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔'' عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! حمد بھائی فرشتہ ہے۔۔۔ فرشتہ۔۔۔جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو سب کے سب کانپنے لگے۔''(۱۵)

سعادت حسن منٹو' کالی شلوار' میں ضعیف الاعتقادی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ ہر شخص بہتر روزگار کی تلاش میں رہتا ہے۔جب نہیں ملتا تو پھر پیروں فقیروں سے تعویز گنڈا کرواتا ہے۔افسانہ نگار یہاں ہمیں سلطانہ کا بتاتا ہے جو پٹنہ اور خدا بخش کو اپنے لیے مسرت کا باعث سمجھتی ہے۔یہاں پہ سلطانہ ضعیف الاعتقادی کا شکار ہے کیونکہ کسی شخص یا جگہ کو اپنے لیے باعثِ رحمت یا زحمت سمجھنا انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے۔اس افسانے سے مثال ملاحظہ کریں:

> ''خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی۔چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔''(۱۶)

اسی طرح جب کوئی پڑھا لکھا روزگار کا متلاشی ہو اور اسے روزگار نہ ملے تو راستے تلاش کرتے کرتے وہ پیروں، فقیروں کے پاس بھی جا سکتا ہے تاکہ ان کے تعویذ، گنڈوں کے اثر سے ہمارے لیے روزگار کے دروازے کھل جائیں۔ سعادت حسن منٹو' کالی شلوار' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی خدمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے یہ کہہ کر شنکر ہنسا اس پر سلطانہ نے کہا کہ تم ہندو ہو اس لیے ہمارے بزرگوں پر ہنستے ہو۔شنکر مسکرایا! ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔خدا بخش تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا، کہنے لگا پرانے قلعے کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔''(۱۷)

خدا بخش کا خدا رسیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا لیکن شنکر کی ذہانت کام آتی ہے۔منٹو دکھاتے ہیں کہ اگر کسی کا کاروبار ٹھیک نہیں چلتا تو وہ بھی بھاگ کر پیر صاحب کے پاس جاتا ہے تاکہ ان سے دعا کروائے اور کاروبار میں بہتری آئے۔ایسے میں بعض اوقات اپنا بچا کھچا سب کچھ پیروں پر لٹا دیا جاتا ہے۔کاروبار میں بہتری یقیناً صرف مسلسل محنت اور صبر سے آ سکتی ہے لیکن ہمارے سماج میں اکثر لوگ شارٹ کٹ کی تلاش میں اپنا نقصان کروا بیٹھتے ہیں۔

پیروں فقیروں کو بھی ایسے شارٹ کٹس تلاش کرنے والوں کی ہی تلاش ہوتی ہے کیونکہ اُن کی زندگی کا پہیہ ایسے لوگوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے ہی چلتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں مشرقی سماج کی توہماتی اقدار کے بخیے ادھیڑنے کی حقیقت پسندانہ کوشش کی اور داخل وخارج کے دونوں زاویوں کو مدنظر رکھا۔انہوں نے کسی خاص فلسفے یا نظریے کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنی دنیا آپ بنائی۔اس ضمن میں انہوں نے نفس انسانی کے نشیب وفراز،عمل ورد عمل شعوری ولاشعوری اعمال کا پردہ چاک کیا زندگی کے لیے ہولناک شہوانی ، ہیجانی اور تلخ حقائق کو آشکار کر کے ضعیف الاعتقادی کے سد باب کی اپنی سی کوشش بھی کی ہے۔ سعادت حسن منٹو کی افسانوی کائنات کا نمایاں ترین موضوعات دھوکا دہی،انتشار،ریا کاری اور ضعیف الاعتقادی ہیں اور یہ موضوعات دراصل ہمارے ہندوستانی سماج کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت حسن منٹو، منٹو راما، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ص۴۳

۲۔ ایضاً ص۱۴۲

۳۔ ایضاً ص۲۸۱، ۲۸۲

۴۔ ایضاً ص۲۸۴، ۲۸۵

۵۔ ایضاً ص۲۰۴

۶۔ ایضاً ص۲۰۵

۷۔ ایضاً ص۲۰۶

۸۔ ایضاً ص۲۰۹

۹۔ سعادت حسن، منٹو، منٹو نما، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) ص۴۲

۱۰۔ ایضاً ص۵۵

۱۱۔ سعادت حسن منٹو، مجموعہ منٹو، (لاہور: زبیر بکس، ۲۰۱۴ء) ص۵۴

۱۲۔ سعادت حسن منٹو، ٹھنڈا گوشت، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء) ص۲۷

۱۳۔ ایضاً ص۱۰۲

۱۴۔ سعادت حسن منٹو، سر کنڈوں کے پیچھے، (لاہور: سنگِ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) ص۲۷

۱۵۔ ایضاً ص۱۶۷، ۱۶۸

۱۶۔ سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) ص۴۸

۱۷۔ ایضاً ص۲۱۷